Date of Publication: 09-10-2013

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 10-11 Oct. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 October 2013 | ۱۵ تا ۲۱ راکتوبر ۲۰۱۳ء

Issue: 39, Vol.: 72 | شمارہ نمبر: ۳۹، جلد نمبر: ۷۲

۱۸۹۴ میں علی گڑھ سے بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد مولانا ظفر علی خاں کچھ عرصہ بمبئی میں نواب محسن الملک کے ذاتی معتمد رہے۔ نواب صاحب کی سفارش کی بنا پر انھیں ریاست حیدرآباد دکن میں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ ریاستی فوج میں رہے، پھر دارالترجمہ سے وابستہ ہوگئے، بعد ازاں ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے رجسٹرار مقرر ہوگئے۔ انھوں نے لارڈ کرزن کی مشہور انگریزی کتاب Gardens of Persia کا اردو ترجمہ 'خیابانِ فارس' کے نام سے کیا، اس پر انھیں حضور نظام دکن کی جانب سے تین ہزار روپے اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے 500 روپے انعام دیا گیا۔ لارڈ کرزن نے خوش ہوکر انھیں طلائی دستے کی چھڑی پیش کی۔

لینڈ چلے گئے لیکن تجارت میں مالی خسارہ ہوا اور سات مہینے وہاں رہ کر وہ بمبئی آگئے۔ چند ماہ بعد دکن میں حالات موافق ہوگئے تو وہ پھر حیدرآباد چلے گئے۔ رسالہ 'دکن ریویو' کا مکرر اجرا عمل میں آیا لیکن خسارے کا یہ ادبی سودا مولانا محض اپنی ذاتی تسکین کے لیے کر رہے تھے، پرچہ پہلے بھی نقصان میں چل رہا تھا اور اب بھی گھاٹے میں جا رہا تھا۔ اچانک ایک نازک صورت حالات پیدا ہوگئی۔ ملازمت خطرے میں پڑنے کے ساتھ 'دکن ریویو' کا مستقبل پانچ سال تک چلنے کے بعد مخدوش ہوگیا۔ مولانا نے 'دکن ریویو' بچانے کی خاطر اس کے حقوقِ ادارت اور ملکیت مولوی سید سرور احمد کو تفویض کر دیے۔ یہ مارچ ۱۹۰۹ کا واقعہ ہے۔

ظفر علی خاں ریاست کی ملازمت

جب اردو نخلستانوں میں خیمہ زن تھی

حیدرآباد سے مولانا ظفر علی خاں کا اخراج

48 گھنٹے میں ریاست چھوڑ دینے کا حکم، ایک اطالوی فلم اس کا سبب بنی

وشواناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا [یوپی] 201303)

حیدرآباد دکن کے ممتاز جریدے 'حسن' کے بند ہوجانے سے ریاست کی ادبی صحافت میں خلا پیدا ہوگیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے یہ کمی پوری کرنے کی غرض سے ماہنامہ 'افسانہ' جاری کیا جس میں انگریزی کے مقبول ناول Mysteries of London کا ترجمہ 'فسانۂ لندن' کے عنوان سے بالاقساط چھپتا تھا۔ ایک سال بعد مولانا کو احساس ہوا کہ اس سے بہتر کام کی گنجائش ہے۔ ۱۹۰۲ میں 'دکن ریویو' کے نام سے علمی و ادبی مجلہ جاری کیا، یہ پرچہ بڑے طمطراق سے نکلتا تھا اور اس کے لکھنے والوں میں اکبر الٰہ آبادی، شبلی نعمانی، رضا علی وحشت، مولوی عبدالحق، نواب نصیر حسین خیال، سرکشن پرشاد، سید کاظم حسین شیفتہ اور نواب عزیز جنگ بہادر شامل تھے۔ قریب دو سال تک یہ رسالہ جاری رہا، اچانک حیدرآباد کی ملازمت ختم ہوگئی اور یہ پرچہ بند ہوگیا۔ مولانا تجارت کی غرض سے ہوائی

میں تھے تو سر مائیکل ایڈوائر حیدرآباد میں برٹش سرکار کے ریذیڈنٹ تھے۔ یہ وہی مائیکل ایڈوائر تھے جو بعد میں پنجاب کے گورنر نامزد ہوئے تھے اور جنھوں نے ملک کی تحریکِ حریت میں حصہ لینے والے افراد پر بے انتہا مظالم ڈھائے تھے۔ انھوں نے آزادی کے متوالوں کو اسیرِ زنداں اور پابندِ سلاسل کیا اور ان کی املاک بحقِ سرکار ضبط کرلیں۔ اسی انگریز گورنر کے حکم سے جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں بے تحاشا گولیاں چلوا کر سینکڑوں معصوم شہریوں کو بھون ڈالا تھا۔ مولانا نے زندگی کے تیرہ سال سرکارِ آصفیہ کی خدمت میں گزارے تھے۔ انھیں 625 روپے ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔ اُن کے صاحبزادے اختر علی خاں کے لیے 200 روپے ماہانہ کا وظیفہ بھی جاری تھا۔ دکن کی سیاست کا پانسہ پلٹا اور انھیں خفیہ طور پر یہ اطلاع ملی کہ وہ بہت جلد ملازمت سے برطرف کر دیے

جائیں گے۔ مولانا کے دل کو بہت چوٹ پہنچی کیوں کہ وہ کرم آباد (پنجاب) کے بعد جو اُن کی جائے پیدائش تھی، حیدرآباد کو اپنا دوسرا وطن سمجھتے تھے۔ انھوں نے پوری تندہی اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ کسی نے انھیں بتایا کہ یہ سب کارستانی مائیکل ایڈوائر کی ہے جو یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ مولانا ایجیٹیٹر ہیں۔ مولانا حیران تھے کیوں کہ پہلے مائیکل ایڈوائر اُن کے بڑے کرم فرما تھے اور ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کچھ لوگوں نے مولانا کے کانوں میں یہ بات ڈال دی کہ نظام سرکار اس لیے اُن سے بدظن ہوگئی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ اُن کا تعلق مولانا جمال الدین افغانی کی تحریک سے ہے اور وہ ایک ایسی سازش رچ رہے ہیں جس کے تحت میر محبوب علی خاں کو تختِ شاہی سے محروم کر کے میر

عثمان علی خاں کو مسندِ حکومت سونپ دی جائے اور نیا حکمران برٹش حکومت سے قطع تعلق کا اعلان کر دے۔ بالآخر مولانا پر افتاد نازل ہوگئی، بارگاہِ خسروی سے فرمان جاری ہوگیا کہ ظفر علی خاں 48 گھنٹے کے اندر ریاست سے نکل جائیں ورنہ انھیں حراست میں لے کر ریاست بدر کر دیا جائے گا۔

ان تمام مفروضہ الزامات میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ یہ سب من گھڑت افواہیں تھیں جو مولانا کو پریشان اور ہراساں کرنے کے لیے پھیلائی گئی تھیں۔ اُن دنوں وہ سرکاری دفتر میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے طور پر کام کر رہے تھے اور کچھ سازشی ذہنوں کو اُن کی اتنی اچھی سرکاری پوزیشن گوارا نہیں تھی۔ پس پردہ بات دوسری تھی جس کا علم مجلے تک پر کسی کو نہیں تھا۔ کچھ دنوں بعد حقیقت منظرِ عام

پر آئی بھی لیکن تب تک بات پرانی ہوچکی تھی اور لوگوں میں اس کی دلچسپی ختم ہوچکی تھی۔ اصل واقعات پر گرد و غبار جم چکی تھی۔

مولانا بھی اپنی بربادی کا سبب مائیکل ایڈوائر کو سمجھتے رہے۔ سچائی کا علم انھیں بعد میں ہوا لیکن تب تک تیر ترکش سے نکل چکا تھا۔ 60-62 سال پہلے کی بات ہے، مجھے اس واقعے کی بھنک ملی۔ میں تجسس میں تھا کہ حقیقت معلوم کروں۔ دلّی اور پنجاب میں مقیم اردو کے اُن پرانے صحافیوں سے ملا جو لاہور سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ تلاشِ بسیار کے بعد کچھ پرانے اخبار ملے، یہ اخبارات ۲۸-۱۹۲۷ کے تھے، جو کچھ پڑھنے اور سننے کو ملا اس کا اختصار یہ ہے:

دراصل یہ سارا فتنہ ایک اطالوی فلم کی وجہ سے پیدا ہوا جو حیدرآباد میں

دکھائی گئی تھی۔ ایک اطالوی فلم کمپنی اپنے بائیسکوپ کے ساتھ لوگوں کو تفریح مہیا کرنے کی غرض سے ہندستان آئی ہوئی تھی۔ جب یہ شو دکھانے کے لیے حیدرآباد پہنچی تو وہاں پر مقیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبہ کی انجمن نے کمپنی کو اس بات کے لیے آمادہ کرلیا کہ وہ ایک شو کی آمدنی علی گڑھ طلبہ یونین کے لیے وقف کردے۔ کمپنی والوں نے فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے نوجوانوں کی یہ بات مان لی تھی۔ ٹکٹوں کی فروخت کا کام نوجوانوں نے اپنے ہاتھ میں لیا اور اُمرائے دولت اور رئیسوں کو اونچے داموں ٹکٹ فروخت کرکے کافی رقم اکٹھی کرلی۔ خاموش فلموں کا دور تھا۔ رات کو جب شو شروع ہوا تو تماشائیوں کو مغربی معاشرت کا ایک حیا سوز نظارہ دیکھنے کو ملا۔ عورتیں اور مرد باہم بڑی بے حیائی سے ڈانس کررہے تھے، ساتھ ہی ساتھ اسٹیج پر سازندے بینڈ بجا رہے تھے اور مغربی تہذیب پوری بے حیائی کے ساتھ عروج پر نظر آرہی تھی۔ حیدرآباد اپنی شرافت اور طہارت کے لیے مشہور تھا۔ وہاں کی اپنی مخصوص تہذیب تھی جس میں اس نوعیت کے جذبات کو برانگیختہ کردینے والے ناچ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں کے شرفا اور اُمرا نے پہلی بار پردے پر یہ نیم عریاں مناظر دیکھے تھے اور اُن کی آنکھیں مارے شرم کے نیچی ہورہی تھیں۔ وہ صرف اس لیے واک آؤٹ نہیں کررہے تھے کہ کہیں آدابِ محفل کی خلاف ورزی کی بنا پر دھر لیے جائیں اور سرکار نامدار کا عتاب سہنا پڑے۔ وہ چپ سادھے یہ سب دیکھتے رہے۔ وقفے وقفے کے بعد فلم کے ذریعے کچھ ڈرامہ بھی دکھایا جاتا تھا اور پھر وہی بے ہنگم مغربی ڈانس شو میں نئے رنگ روپ میں پردے پر آنے لگتا۔

شو کے اختتام پر کمپنی والوں کا شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری مولانا ظفر علی خاں کے سپرد کی گئی کیوں کہ وہ تقریر بہت اچھی کرلیتے تھے اور شعر وشاعری کی آمیزش سے اسے اور بھی جاندار بنادیتے تھے۔ مولانا نالاں ہوکر غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر پہنچتے ہی انھوں نے حسب عادت دھواں دھار تقریر شروع کردی۔ فلم کو اخلاق سوز قرار دیتے ہوئے اس کی نمائش کی مذمت کی اور کمپنی کو آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ نوجوانوں کو بے حیائی کی جانب مائل کررہی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، ہم مشرق والوں کو یہ مغربی تہذیب راس نہیں آسکتی۔ اگر ایسی فلمیں دیکھ کر ہندستان کے مرد وزن نے بھی اطالوی تہذیب کی نقالی شروع کردی تو ہمارے اخلاق اور ایمان کا خاتمہ یقینی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ کمپنی اپنا بوریا بستر گول کرلے اور کل ہی یہاں سے روانہ ہوجائے۔ شو کے منتظمین سکتے میں آگئے۔ کہاں داد وتحسین ملنے کی تمنا تھی اور کہاں یہ اولے برسنے لگے۔ تماشائیوں نے خوب تالیاں بجائیں اور بے حیائی ہائے ہائے کے نعرے بلند کیے۔

مولانا اگلے روز ڈیوٹی انجام دینے سرکاری دفتر میں پہنچے تو ہوم سکریٹری نے اُنھیں چیمبر میں بُلا کر مدارالمہام مہاراجہ سرکشن پرشاد کا خط دکھایا جس میں ریذیڈنٹ سرمائیکل ایڈوائر نے شو میں ہونے والے واقعات کی جواب طلبی کی تھی۔ خط میں مزید لکھا گیا تھا کہ ریاستی سرکار کے ایک ذمہ دار عہدیدار ہونے کے باوجود مولانا نے کل رات کھلے طور پر نہایت بے باکی سے مغربی تہذیب پر اتنی سخت تنقید کیوں کی اور کیوں بے وجہ غیرملکی مہمان کمپنی کو پریشان اور ہراساں کیا۔ مولانا کی غیرت نے یہ سب کچھ گوارا نہ کیا اور جواب دہی کے لیے مہلت مانگنے کی بجائے فوراً ہی اپنا موقف تحریر کرکے ہوم سکریٹری کے حوالے کردیا۔ دورانِ گفتگو مولانا نے مہاراجہ سرکشن پرشاد پر اپنی پوزیشن واضح کردی کہ نیم عریاں رقص دیکھ کر اُن کی دینی غیرت نے جوش مارا تھا جس کے زیر اثر انھیں یہ سب کہنا پڑا ورنہ انھیں اطالوی کمپنی سے کوئی پرخاش نہیں بلکہ کمپنی چاہے تو اپنی کسی صاف ستھری فلم کی نمائش کے لیے بے شک حیدرآباد میں رُکی رہے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہت بُردبار آدمی تھے اور اُن میں صبر وتحمل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ دل سے مولانا کے قدردان تھے اور جانتے تھے کہ انھوں نے دورانِ تقریر جو کچھ کہا وہ محض وقتی جوش وخروش کے تحت کہا اور اس کا مقصد اطالوی سرکار سے تعلقات خراب کرنا ہرگز نہیں تھا۔ مولانا کے جواب سے وہ پوری طرح مطمئن تھے لیکن مائیکل ایڈوائر کو اطمینان نہیں ہوا اور اخراج کا فرمان صادر ہوکر رہا۔ اس طرح مولانا واپس کرم آباد پہنچ گئے اور اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضور نظام دکن کا دل مولانا کے تئیں شیشے کی طرح صاف تھا اور درپردہ مالی امداد مولانا کے لیے جاری رہی۔

ریاست سے اخراج کے دس برس بعد دلّی کے ریلوے اسٹیشن پر ایک بار اچانک مولانا کو نظام دکن کے دیدار کا موقع ملا۔ مولانا فی الفور شعر کہنے پر قادر تھے۔ ریلوے کی ویٹنگ روم میں کھڑے کھڑے ایک مرصع نظم کہہ ڈالی اور نظام کی خدمت عالیہ میں پیش کی۔ نظم کا ایک شعر یہ تھا:

شاہ اسلام کے ... میں دس سال کے بعد
لعل لایا ہوں نہ یاقوت و گہر لایا ہوں

■❖■

دوسری اور آخری قسط

سرور صاحب میری نظر میں

ولادت: ۷/اکتوبر ۱۹۱۲ — وفات: ۹/ فروری ۲۰۰۲

گیان چند جین

سرور صاحب میں کمال کی خوبی یہ ہے کہ کسی میدان میں بند نہیں، ہر باب میں سرخ رو ہوتے ہیں۔ وہ کلاس میں پڑھاتے ہیں تو طلبہ کو کیا کیا نکتے، نثر اور نظم کی کیا کیا دولت دیتے ہیں۔ تحریر میں ان کا خاص میدان تنقید ہے جو اپنے حسنِ انشا کے سبب تخلیق کی طرف فرار کرنے کو بے چین رہتی ہے۔ وہ بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے استادانِ فن پرانی دستاویز تیار کردیتے تھے، ایسا جعلی کاغذ جو جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم معلوم ہو۔ اس نسبت سے سرور صاحب کو مخطوطہ شناس یا کم از کم مخطوطہ باز محقق ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے لیے تنقید کی وادی پسند کی۔ ان کی تنقید محض لفظوں کی بازی گری نہیں ہوتی، اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث موضوع کے بارے میں ہمیں اس پہلو کا احساس نہ تھا۔ ان کے تجزیے پر آمنّا وصدقنا کہتے ہی بنتی ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ سرور صاحب کی تنقید کا انداز یہ ہے کہ یوں بھی ٹھیک ہے اور ووں بھی ٹھیک، مجھے اس پھبتی سے اتفاق نہیں۔ ان کی تنقید میں تجزیہ اور تفہیم کا بھرپور سرمایہ ہوتا ہے اور تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے تخلیق کے سوتے بھی بند نہیں۔ وہ قابل ذکر شاعر ہیں، ان کا ایک مصرعہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا ہے:

چاند چھو لینے کا قصہ بھول بھی جانے کی بات

ان کا تیسرا میدان ادبی محفلیں ہیں۔ احتشام صاحب اپنی اداس سنجیدگی کے باوجود اردو کے اساتذہ میں بہترین مقرر تھے۔ ڈائس پر سرور صاحب کا رنگ دوہرا ہے۔ یہاں آکر وہ جمال پرست معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں جب قرمزی ترکیبیں اور شعریت بیز فقرے لڑھکانے شروع کرتے ہیں تو نثر شعر ہوجاتی ہے اور مشاعروں کی سی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ حسین فقروں کا ذخیرہ لاانتہائی معلوم ہوتا ہے اور یہ نہ سمجھیے کہ ان کا سرمایہ محض بسی ہوئی بجلیاں، مقدس سنجیدگی اور شیریں دیوانگی جیسے فقرے ہی ہیں۔ ان کے یہاں مغز بھی ہوتا ہے۔ کسی سیمینار میں انھیں صدارت کرتے دیکھیے۔ مقالہ نگار علما جب اپنے گاڑھے مقالے سنا چکتے ہیں تو سرور صاحب کے صدارتی مشاہدات ان سے بھی زیادہ معلومات افروز ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۰ کے اواخر یا ۱۹۸۱ کے اوائل میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے نظیر اکبرآبادی پر ایک دیدہ ورانہ مقالہ پڑھا۔ سرور صاحب صدارت کررہے تھے۔ انھوں نے جو صدارتی تبصرہ کیا وہ مستقل تقریر کا طول پکڑ گیا۔ لیکن اسے سن کر معلوم ہوا کہ نظیر اکبرآبادی کو ہم نے آج سمجھا ہے۔

سرور صاحب کا چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ کمیٹیوں کے لیے بہترین رکن ہیں۔ کسی قسم کی کمیٹی ہو، سرور صاحب اس کے ارکان میں نمایاں ترین مقام حاصل کرلیں گے۔ ان کے مشاہدات سب سے زیادہ توجہ سے سنے جائیں گے۔ وہ اپنے خیالات اس ڈھنگ سے ادا کریں گے کہ اپنی بیشتر باتیں منوالیں گے۔ اگر کوئی ایسی کمیٹی یا مجلس ہو جس میں اردو والوں کے علاوہ دوسرے موضوعات کے نمائندے بھی ہوں، تو ان سے بہتر اردو کا سفیر نہیں ہوسکتا۔ ملک کے باہر وہ کسی وفد کی درسگاہ میں جائیں، اغیار کو متاثر کرکے آئیں گے۔ اہلِ اردو ناز سے انھیں پیش کرسکتے ہیں کہ دیکھو اردو کا پروفیسر اس قسم کا ہوتا ہے، وہ گھونچو قسم کا مولوی نہیں ہوتا بلکہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کے دوش بدوش چلتا ہے، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا ہے۔

اپنے موضوع سے جو رچا ہوا خلوص اگلی نسل کو تھا وہ بعد والوں کو نہیں۔ میں سرور صاحب کے ساتھ کئی بار سلکشن کمیٹیوں میں بیٹھا ہوں۔ وہ ہر امیدوار

سے جس طرح مفصل بات کرتے ہیں، اس کی پسند کے موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں، وہ انہی کا حوصلہ ہے۔ مجھے جلدی ہوتی ہے کہ اس شخص کو منتخب تو کیا نہیں جاسکتا، اس پر زیادہ وقت کیوں خراب کیا جائے۔ لیکن سرور صاحب ہر امیدوار کو مطمئن کردیتے ہیں کہ اس پر سے سرسری نہیں گزرا گیا۔ خوبی یہ ہے کہ ہر امیدوار سے اس کے خصوصی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تاکہ اسے اپنی معلومات کی نمود کرنے کا پورا موقع مل سکے۔ اسے بھی پریشان نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ڈگریوں کے زبانی امتحان (وائی وا) میں ہوتی ہے۔

ایک بار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لیکچرر کا سلکشن تھا۔ شام کا وقت تھا۔ امیدواروں کی ایک بڑی کھیپ تھی۔ سرور صاحب اور میں ان کو ٹھکانے لگانے کے لیے بلائے گئے۔ شام کی گاڑی سے میرا الٰہ آباد کا ریزرویشن تھا اور وہ اسی گاڑی سے علی گڑھ جانے والے تھے۔ سلکشن سے پہلے میں نے سرور صاحب کو متنبہ کیا کہ امیدواروں کی کثرت کے پیش نظر ہر شخص کو محض پانچ منٹ دیے جائیں۔ وہ ظاہراً مان گئے لیکن سوالات کرتے وقت بھول گئے اور حسب معمول درازنفسی اختیار کی۔ میں بار بار ٹوکتا رہا۔ آخر میں نے وائس چانسلر صاحب سے کہا کہ میں اپنی گاڑی نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ لوگ فیصلہ کرلیجیے، میں چل دوں گا۔ قسمت سے آخر میں کچھ امیدوار ایسے خس اور چاٹ آگئے کہ ان سے بات کی بات میں نپٹ لیا گیا اور کام پورا ہوگیا۔ سرور صاحب اور میں افتم خیزم ریل پر پہنچے لیکن اس طرح کہ گاڑی چھوٹنے کو تھی۔ مجھے اپنی محفوظ سیٹ ہاتھ نہ آئی۔ جلدی سے کہیں بیٹھ گئے۔ بعد میں غازی آباد میں اپنا ٹھیک ڈبا معلوم کرکے منتقل ہوئے۔ اسی دن سہ پہر میں مکتبۂ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں نے مجھے کیفی کا مجموعہ 'آوارہ سجدے' اور جاں نثار اختر کا مجموعہ 'خاک دل' مفت تفویض کیا تھا۔ میں یہ دو کتابیں ہاتھ میں لیے تھا۔ بوکھلاہٹ میں غازی آباد میں جو ڈبا تبدیل کیا وہ دونوں کتابیں وہیں چھوٹ گئیں۔ صبح تڑکے فتح پور میں پہلے والے ڈبے میں جاکر دیکھا لیکن وہاں کتابوں کا پتا نہ تھا۔ کوئی صاحب ذوق پاکر وہ ذوق انھیں لے اڑا تھا۔ مال مفت دل بے رحم، یا مفت راہ گمت، کتابیں گئیں تو گئیں سلکشن کا حق تو ادا ہوگیا۔ چوں کہ اکثر انتخابات میں بیشتر امیدواروں کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نام پر غور نہیں کرنا، میں ان پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا لیکن سرور صاحب کا اصول ہے کہ ہم جس کام کے لیے آئے ہیں اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔

اس کے برعکس میرا وطیرہ ملاحظہ ہو، ایک بار میسور یونیورسٹی میں پروفیسر کی پوسٹ کا سلکشن تھا، رفیعہ سلطانہ اور یہ ناکس دو ناچیز منتخب کار تھے۔ غالباً چار بجے سلکشن شروع ہوا۔ قائم مقام وائس چانسلر نے بتایا کہ اسے پانچ بجے کسی دوسری میٹنگ میں جانا ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اتنی دیر میں سب امیدواروں کو ٹھکانے لگادیں گے۔ آٹھ دس رہے ہوں گے۔ آخری امیدوار خالصہ کالج دہلی کے شہاب جعفری تھے۔ بوجوہ یہ صاف تھا کہ یونیورسٹی پروفیسر کی جائیداد ان کے نام ہبہ نہیں کی جاسکتی۔ میں نے ان سے ان کی ابتدائی ریسرچ کے بارے میں گفتگو کرکے باب سخن بند کردیا۔ وہ کہا کیے کہ مجھ سے کچھ تو پوچھیے۔ میں نے تیز دستی دکھائی کہ ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں آپ سے سوال نہ کریں گے۔ وہ مُصر رہے لیکن ہم نے بساط تہ کردی اور کسی کو منتخب نہیں کیا۔ سرور صاحب ہوتے تو میں یوں گھاس نہ کاٹ سکتا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ جب پہلے سے فیصلے کا کم و بیش اندازہ ہوتا ہے تو ڈرامے کو طول دینے سے کیا فائدہ۔ سرور صاحب کو امیدوار کی اور اپنی تشفی عزیز ہے۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ سرور صاحب کمیٹیوں کے لیے بہترین آدمی ہیں، یہ ان کی طاقت بھی ہے کمزوری بھی۔ اردو کی ہر اعلا کمیٹی، اکیڈمی، بورڈ وغیرہ کے لیے ان کے نام کی یاد آتی ہے کیوں کہ کمیٹی کے کام میں ان سے جو رہنمائی اور مدد ملتی ہے وہ دوسروں سے کم ملتی ہے۔ ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام صاحب سے کسی کام کو کہا۔ مالک رام راوی ہیں کہ انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ذرا سرور صاحب سے پوچھ لوں۔ اس پر ذاکر صاحب بھڑک گئے اور کہنے لگے کہ کیا بات ہے اردو والوں کا کوئی کام سرور صاحب اور احتشام صاحب کے بغیر نہیں ہوتا۔ جواب صاف ہے کہ یہ ان دونوں کی صلاحیتوں کے باعث تھا۔ ہر جہت سے اتنی زیادہ مانگ سے نقصان یہ ہوا کہ سرور صاحب نے خود کو ہر معاملے میں پھنسا لیا۔ انسان کا وقت اور ذہنی توانائی محدود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جتنا ہضم کرپاتے اس سے زیادہ چبالیتے ہیں اور جتنا چبا سکتے ہیں اس سے زیادہ کترلیتے ہیں۔ وہ اتنی ذمہ داریاں قبول کرلیتے ہیں کہ ان کو پورا نہیں کرسکتے۔ ان پر ہمیشہ کاموں کا بقیہ واجب رہتا ہے۔ غالب نے کہا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

لیکن ان کی ہوس کو نشاط تکمیل کار کا منہ دیکھنا شاذ ہی ملتا ہوگا۔ اب تو وہ ممتحنی چھوڑ چکے لیکن جس زمانے میں یہ کام کرتے تھے تو یہ ہوتا تھا کہ کسی یونیورسٹی میں سب کی کاپیاں جانچ کر آ گئی ہیں صرف سرور صاحب کی کاپیاں باقی ہیں تقاضے پر تقاضے جارہے ہیں، تار کھڑکائے جارہے ہیں، مگر ادھر سے صدائے برنخاست۔ نتیجہ رکا پڑا ہے۔

سرور صاحب ٹال مٹولیات کے بادشاہ نہیں ہیں۔ اگر کسی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ سرور صاحب کے پاس پہنچ گیا تو وہ نصف صدی کے لیے ضبط ہوگیا۔ کب سرور صاحب کو فرصت ہوگی اور کب وہ رپورٹ بھیجیں گے۔ امیدوار ان کی زلف سر ہونے تک جیتا بھی رہے گا کہ نہیں؟ سنا ہے کہ ان کے انتظار خانے کے بعض مظلوموں نے اپنی جانِ شیریں جاں آفریں کے سپرد کردی۔ مقالے کی رپورٹ تو بڑی چیز ہے، انھیں تو چٹھیوں کے جواب دینے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ غالب صدی کے زمانے میں، میں نے مدیر 'نقوش' کو لکھا کہ غالب کے خود نوشت مخطوطات سے متعلق 'ہماری زبان' کے جملہ مضامین اور مراسلے 'نقوش' میں ڈائجسٹ کرلیجیے اور سرور صاحب کو لکھ کر ان کے تراشے منگا لیجیے۔ ۲۹ر جنوری ۱۹۷۱ کے خط میں طفیل صاحب نے مجھے لکھا:

''اگر ہفتہ کے جملہ شمارے مجھے مل جائیں تو ان کی اشاعت کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ مگر جن کا نام آل احمد سرور ہے وہ اللہ میاں کی بات سنتے ہوں تو سنتے ہوں، میری تو مطلق نہیں سنتے''۔

اب میری چٹھیوں کا تو جواب مل جاتا ہے۔ پہلے ایسا نہ تھا۔ گوناگوں مصروفیات کے باعث وہ کس کام کو پورا کرپاتے ہیں؟ ان کے نامۂ اعمال میں نامکمل کاموں کا ایک طومار بندھا ہے۔ شروع میں وہ علی گڑھ گئے تو امریکہ کے کسی شاہ برج کی طرف سے انھیں ایک منصوبے کے تحت ریسرچ پروفیسر رکھا گیا جس میں شاید غالب کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا۔ وہ کام منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ رشید صاحب کی صدارت شعبہ ہی کے زمانے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے تاریخ ادب اردو کا منصوبہ ملا۔ رشید صاحب سبک دوش ہوکر یہ میراث سرور صاحب کو تفویض کرگئے۔ رشید صاحب نے مجنوں گورکھپوری کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر بنا کر بلالیا۔ سبحان اللہ کیا انتخاب تھا علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی بزرگی مسلّم، لیکن کہاں تاریخ ادب اور کہاں رشید صاحب۔ سرور صاحب اور مجنوں صاحب یہ لوگ ادیب ہیں، مورخ ادب نہیں۔ ثمرہ یہ ہوا کہ اس تاریخ کا ناقص اور پر از اغلاط رہ جانا سرور صاحب کے دامن پر سب سے بڑا دھبا بن کے رہ گیا۔

علی گڑھ سے سبک دوشی کے بعد شملے کے انسٹی ٹیوٹ میں بھی سرور صاحب نے کوئی کام کیا ہے لیکن وہ مکمل ہوکر سامنے آئے تو ہم جانیں۔ سرور صاحب مقالے بہت اچھے لکھتے ہیں، سیمینار اعلا سے اعلا پا کرسکتے ہیں، لیکن ایک موضوع پر مستقل کتاب لکھنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ ادھر کچھ پہلے مجھ سے اعتراف کرتے تھے کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مشغولیات میں بہت وقت گنوایا۔ ان سب کو چھوڑ کر کوئی ٹھوس کام کرتا تو اچھا ہوتا:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہمیں تو ان کے بارے میں یہ احساس ہمیشہ سے تھا۔ کتنے موضوعات ہیں جنھیں جس خوبی سے وہ سرانجام دے سکتے ہیں دوسرا نہیں دے سکتا۔ نقد ادب کے کسی پہلو پر یا اردو ادب پر مغربی ادب کے اثرات پر وہ کوئی مستقل کتاب لکھ دیتے تو اس کا جواب نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سب کہنے کے باوجود ان کے مضامین کی غیر معمولی افادیت سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن اگر وہ انھیں موضوعات پر مستقل کتاب لکھتے تو وہ سونے سے بڑھ کر کندن ہوتی۔

کتنے ادارے ہیں جن کے بارے میں سرور صاحب کے نام کے بغیر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ عرصۂ دراز تک وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری رہے۔ 'ہماری زبان' کو انھوں نے ایک زندہ پرچہ بنا دیا۔ وہ عبدالحق کی تحقیق روایت تو برقرار نہ رکھ سکے۔ کوئی تذکرہ وغیرہ شائع نہیں کیا، رسالہ 'اردو ادب' کو بھی تحقیق سے ہٹا کر تخلیق کی ڈگر پر لے جانا چاہا، لیکن اپنے مزاج کے مطابق کچھ کیا تو۔ کتابوں کی اشاعت کا معاملہ علاحدہ۔ موج میں کام گنج پوشیدہ ہونے کے مترادف ہے۔ کتابت و طباعت کے بعد سے بیچ وسائل لکھنا ہفت خوان سر کرنا ہے۔ سب پر مستزاد مالیات۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن میں بعض مسودوں کی اشاعت میں کچھ زیادہ ہی تعویق ہوتی تھی۔ میں نے اپنا ڈی لٹ کے مقالے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' کا مسودہ ۱۹۶۰ میں انجمن کو دے دیا۔ بعد تقاضائے بسیار ۱۹۶۹ میں شائع ہوا۔ لیکن دوسرے ایڈیشن کے لیے ترمیم شدہ مسودہ انجمن میں ۱۹۷۵ یا ۱۹۷۶ میں دیا، شائع ہوا ۱۹۸۶ میں۔ مگر صاحب کا نہیں اس مقالے ہی کا قصور ہوگا۔

انجمن نے منشی مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات خریدے تھے، انھی میں ان کی مرتبہ خطوط غالب جلد دوم کا مسودہ تھا۔ انجمن مالک رام کی مدد سے اسے شائع کرنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام سے کہا کہ انھیں یہ مسودہ دکھائیں۔ وہ سرور صاحب کے پاس پہنچا تھا، ان سے دو چار دفعہ مانگا گیا وہ کہتے رہے کہ گھر میں کہیں رکھا ہے، تلاش کرکے بھیج دوں گا۔ اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام صاحب سے کہا 'جب یہ (سرور صاحب) مریں گے تو ان کے گھر سے کئی مسودے برآمد ہوں گے۔'

وہ ایک لمبی مدت تک ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی کے صدر رہے۔ کرشن چندر کو ساہتیہ اکادمی کا انعام نہیں ملا۔ اس کے لیے وہ سرور صاحب کو مورد الزام ٹھہراتے تھے کہ وہ ترقی پسندوں کے دشمن ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ راجندر سنگھ بیدی تو ایوارڈ لا چکے ہیں۔ بیدی بھی ایک زمانے میں ترقی پسندوں میں گنے جاتے تھے۔ اس صدی کی پانچویں دہائی میں بیشتر بڑے ادیب ترقی پسند تھے یا کم از کم ان کے ہم سفر تھے۔ سرور صاحب بھی قیام لکھنؤ کے زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بزم آرائی کرتے تھے۔ جگن ناتھ آزاد کہتے تھے کہ میں نے سرور صاحب سے کہا 'ہم نے آپ ہی سے ترقی پسندی سیکھی تھی اب آپ ہی اسے چھوڑ دیں تو کیا کیا جائے۔' سرور صاحب ترقی پسند سے

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

اردو دُنیا

اردو اساتذہ کی بھی تقرری کی جائے

گزشتہ سال نکالی گئی 641 پوسٹوں میں سے ایک بھی اردو ٹیچر کی پوسٹ نہیں تھی

نئی دہلی (۳۰ ستمبر)۔ بی جے پی کے اقتدار والی دہلی کارپوریشن اردو کے فروغ کے لیے کتنی سنجیدہ ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ گزشتہ سال شمالی دہلی کارپوریشن نے اساتذہ کی 641 اسامیاں نکالی تھیں لیکن ان میں سے ایک بھی پوسٹ اردو ٹیچر کے لیے نہیں تھی اور اب اطلاع کے مطابق شمالی دہلی کارپوریشن پھر سے اساتذہ کی تقرری کے لیے اشتہار نکالنے جا رہا ہے۔ اردو کو اس کا حق دلانے میں مصروف افراد نے مطالبہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے بھی مثبت قدم اٹھایا جائے اور آنے والے اشتہار میں اردو اساتذہ کو بھی شامل کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس زون میں ایک نوڈل افسر کی تقرری اور اردو مترجم کا بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ شمالی دہلی کارپوریشن پر اگر ایک نظر ڈالیں تو اس میں کل پانچ زون آتے ہیں، ان میں سٹی زون، قرول باغ زون، روہنی زون، صدر پہاڑ گنج زون اور نریلا زون آتے ہیں۔ ان میں سٹی زون اور صدر پہاڑ گنج زون مسلم اکثریتی زون ہیں۔ اطلاع کے مطابق روہنی میں کئی سال سے اردو اساتذہ کی تقرری نہیں ہو پائی ہے۔ شمالی دہلی کارپوریشن میں کل 692 اسکول ہیں، ان میں سے 30 اسکول اردو میڈیم کے ہیں، ان اسکولوں میں 130 اردو اساتذہ (کنٹریکٹ اور مستقل) پڑھاتے ہیں۔ کل ملا کر ان اسکولوں میں تقریباً 70 ہزار طلبہ اردو پڑھنے والے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے محض 130 اساتذہ ناکافی ہیں اس لیے مزید 30 اردو اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ کارپوریشن آئے دن نئے اسکول قائم کرتی ہے مگر کئی سالوں سے ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں کھولا گیا۔ گزشتہ دنوں اردو بیکیٹ ٹیچر ایسوسی ایشن (استاد) کے جنرل سکریٹری نورالدین کی قیادت میں ایک وفد نے شمالی دہلی کارپوریشن کے کمشنر سے ملاقات کی تھی۔ وفد نے مطالبہ کیا تھا کہ اردو اساتذہ کی تقرری کو بھی ترجیح دی جائے اور ہر اسکول میں جہاں اردو پڑھنے والے طلبہ ہوں وہاں اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ کمشنر نے ان مطالبات پر غور کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی مگر اس پر عمل ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ غور طلب ہے کہ تینوں کارپوریشن کی تقسیم کے بعد سے مشرقی دہلی کارپوریشن کی طرح شمالی دہلی کارپوریشن میں بھی ایک بھی اردو ٹیچر کا تقرر نہیں ہو پایا ہے۔ شمالی دہلی کارپوریشن نے ۱۷ دسمبر ۲۰۱۲ کو 641 اسامیوں کے لیے پہلا اشتہار نکالا تھا جس میں ایک بھی اردو استاد کی پوسٹ نہیں تھی۔ جہاں تک نوڈل افسر کے تقرر کا معاملہ ہے تو مشرقی دہلی میں نوڈل آفیسر کا تقرر تو ہوا مگر برائے نام لیکن اب شمالی دہلی کارپوریشن میں نوڈل افسر کے تقرر کا معاملہ بھی اٹھایا گیا ہے۔

فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے صدر عبدالعلیم برنی اور جنرل سکریٹری شکیل احمد نے دیگر مطالبات کے ساتھ اردو مترجم کے تقرر کا بھی معاملہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے ایل جی، وزیر اعلیٰ اور لوکل باڈی ڈائرکٹر کارپوریشن سے ملاقات بھی کی ساتھ ہی مکتوب بھی لکھے۔ لوکل باڈی ڈائرکٹر نے ان مطالبات کے لیے تینوں کارپوریشن کے کمشنروں کو کارروائی کرنے کی ہدایت بھی دی مگر ابھی تک کچھ نہیں ہو پایا۔ ریمائنڈر دینے پر ڈائرکٹر نے نوڈل افسر کی تقرری کے لیے حامی بھر دی ہے مگر تقرری کب ہوگی یہ دیکھنا باقی ہے۔ فیڈریشن کا کہنا ہے کہ اردو اساتذہ کی تقرری اور دیگر مطالبات کے منظور ہونے تک ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔

(انقلاب۔دہلی)

ایل جی ہاؤس سے اب اردو میں بھی اخباری بیانات جاری ہوں گے

نئی دہلی (۳۰ ستمبر)۔ قومی راجدھانی دہلی میں اردو کے دوسری سرکاری زبان ہونے کے باوجود لیفٹننٹ گورنر ہاؤس میں برسوں سے اردو کو جگہ نہیں مل پا رہی تھی مگر حال ہی میں قومی راجدھانی کے لیفٹننٹ گورنر جناب نجیب جنگ کی اردو سے دلچسپی نے اردو کو اس کا کھویا مقام دلانے کی خوش آئند پیش رفت کی ہے۔ ایل جی ہاؤس میں میڈیا سیل کے ذرائع نے بتایا کہ اب ایل جی ہاؤس سے اردو میں بھی اخباری بیانات جاری ہوں گے۔ جس کے لیے ایک اردو کے مترجم کو یہاں رکھا گیا ہے جو کہ ایل جی کے ذریعے جاری اخباری بیانات کا ترجمہ کر کے اردو اخبارات کو ارسال کریں گے۔ میڈیا ہاؤس کے ایک ممبر نے بتایا کہ اردو میں اخباری بیانات بھیجنے کا عمل شروع ہو گیا ہے آج ایل جی نجیب جنگ کی میٹنگ کی تفصیلات بھی اردو میں روانہ کی گئی ہیں۔ واضح ہو کہ نجیب جنگ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں، انھوں نے اپنے وی سی ہونے کے دوران جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اردو میں پریس ریلیز جاری کروانا شروع کیا تھا جو کہ اب تک چل رہا ہے جبکہ جامعہ سے اس سے قبل صرف انگریزی میں اخباری بیانات جاری ہوتے تھے۔

(انقلاب۔دہلی)

راشن کارڈ دوسری سرکاری زبان اردو میں بھی جاری کرنے کی اپیل

نئی دہلی (۲۷ ستمبر)۔ انجمن اردو دوست کانفرنس نے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت سے راشن کارڈ اردو زبان میں بھی جاری کیے جانے کی اپیل کی۔ انجمن کے کنوینر ایاز محمود نے کہا کہ قانونی طور پر دہلی کی شیلا سرکار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ بہت پہلے سے ہی دے رکھا ہے اور چوں کہ اردو دہلی کی ایک عوامی زبان ہے اس لیے ماضی کی طرح راشن کارڈ اور اس کے درخواست فارم اردو میں جاری کیے جائیں۔ ایاز محمود نے واضح کیا کہ ان دنوں زیادہ تر مسلمان شیلا سرکار سے اس بات پر ناراض ہیں کہ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو دیا مگر اس کا کوئی عملی ثبوت پیش نہیں کیا۔ انتخابات کے موسم میں اردو والوں کو اردو میں راشن کارڈ مہیا کرانے کافی حد تک ان کی ناراضگی دور کرنے کا اچھا موقع ہے۔ ایاز محمود نے مطالبہ کیا کہ راشن کارڈ دفتر میں اردو سے واقفیت رکھنے والوں کی تقرری کی جائے۔

(راشٹریہ سہارا۔دہلی)

ڈاکٹر رضا حیدر، غالب انسٹی ٹیوٹ کے نئے ڈائرکٹر مقرر

نئی دہلی (پریس ریلیز، ۳۰ ستمبر)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور ادارے کے اہم ممبران نے اتفاق رائے سے نوجوان اسکالر ڈاکٹر رضا حیدر کو ان کی محنت، صلاحیت اور لیاقت کو دیکھتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کا نیا ڈائرکٹر منتخب کیا ہے۔

دلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا حیدر نے غالب انسٹی ٹیوٹ جوائن کیا تھا، وہ ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز تھے اور اب انھیں ترقی دے کر ڈائرکٹر کا اہم منصب سونپا گیا ہے۔

ڈاکٹر رضا حیدر کی مرتبہ کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کے مضامین برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دہلی کے علاوہ ہندستان کے مختلف گوشوں میں بھی وہ ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ تصوف پر ان کی لکھی ہوئی کتاب کو علمی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ان کی پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور شاہد ماہلی کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے شائع ہوئی کتاب 'غالب اور عہد غالب' تمام علمی حلقوں میں بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کریں گے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی کو ادارے کا مشیر خاص مقرر کیا گیا ہے۔

اردو کا فروغ قومی یکجہتی کا فروغ

محکمہ تعلیم، حکومت دہلی کی جانب سے اردو اساتذہ کا تقرر نہ ہونا افسوس ناک

نئی دہلی (۲۵ ستمبر)۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کی ایک میٹنگ پروفیسر عبدالحق (پروفیسر ایمریٹس، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) کی صدارت میں مرکزی دفتر تنظیم، جامع مسجد دہلی میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر عبدالحق نے یو پی ایس سی سے عربی، فارسی ہٹائے جانے کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے از سر نو شامل کیے جانے کی سفارش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو آج نازک دور سے گزر رہی ہے۔ عربی، فارسی کے ہٹائے جانے سے اردو مزید کمزور ہوگی۔ پروفیسر عبدالحق نے مزید کہا کہ یو پی ایس سی سے عربی، فارسی ہٹائے جانے سے اردو اس عوام میں کم دلچسپ ہے۔ مرکزی حکومت اپنی مداخلت سے یو پی ایس سی میں عربی، فارسی کو شامل کرے۔

اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر سید ریو نے کہا کہ حکومت دہلی نے گزشتہ 15 برسوں سے اردو کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ اردو پڑھنے اور پڑھانے والوں کے ساتھ حکومت دہلی کا رویہ اس لحاظ سے تکلیف دہ رہا کیوں کہ اس دوران محکمہ تعلیم کے ذریعے ایک بھی مستقل اردو ٹیچر بحال نہیں کرایا جا سکا ہے۔ جب کہ حکومت دہلی ہر الیکشن سے پہلے مستقل اردو اساتذہ کے تقرر کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر سید ریو نے مزید کہا کہ حکومت دہلی اپنی اخلاقی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے مستقل اردو ٹیچرز مہیا کرائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دہلی حکومت کے سبھی سرکاری اسکولوں میں لازمی طور پر کم از کم ایک اردو ٹیچر کا تقرر کیا جائے تاکہ کسی حد تک جو حق تلفیاں اردو کے ساتھ گزشتہ پندرہ سال سے جاری ہیں اس میں کمی لائی جا سکے۔ ڈاکٹر سید ریو نے یہ بھی یاد دلایا کہ گزشتہ سال دہلی میں کارپوریشن کے الیکشن کے وقت حکومت دہلی نے 200 اردو ٹیچر کے تقرر کا اعلان کیا تھا مگر افسوس کہ اس پر بھی عمل نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے ہم دہلی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق فوری طور پر 200 اردو ٹیچر کا تقرر عمل میں لائے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ صوبائی اردو اکیڈمیاں 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کا اہتمام کریں اور اس موقع پر اپنے محسنین کے نام سے ایوارڈ دینے کا سلسلہ بھی شروع کریں۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے اپنے بیان میں کہا کہ اردو پورے ملک میں یکساں مقبول ہے اس لیے اردو کا فروغ قومی یکجہتی کا فروغ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صوبائی حکومتیں اردو کے تئیں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے زمینی سطح پر منصوبہ بند کوشش کریں۔

اس موقع پر عالمی یوم اردو استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جس میں دہلی کے مختلف حصوں سے نمائندگان کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

(محمد عمران قنوجی)

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کی جانب سے جدید نصاب کے مطابق اردو میڈیم کی سائنس وریاضی انٹر سال دوم کی درسی کتب کی اشاعت

حیدرآباد (۲۳ر ستمبر)۔ سکریٹری راما سنکر نائک (آئی اے ایس) کی سرپرستی میں بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن آندھراپردیش کی جانب سے جدید نصاب کے مطابق قومی سطح کے مسابقتی امتحانات کے ذریعے میڈیسن اور انجینئرنگ کے لیے نیٹ (NEET) اور آئی سیٹ (ISEET) میں حصہ لینے والے طلبہ اور اردو میڈیم انٹر سال دوم کے طلبہ کے لیے بی پی سی اور ایم پی سی گروپ کی درسی کتب (طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات اور ریاضی IIA اور IIB) تیار کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری اسپیشل آفیسر اردو مسز عابدہ سلطانہ کی نگرانی میں انجام پائی۔ اردو اکیڈمی نے درکار رقم فراہم کیا اور تلگو اکیڈمی نے کتابوں کی طباعت کا کام انجام دیا۔ اسپیشل آفیسر اردو بورڈ آف انٹر میڈیٹ ایجوکیشن مسز عابدہ سلطانہ کے بموجب انٹر سال دوم کی ان جدید درسی کتب کے علاوہ سال اول کی کامرس کی درسی کتب اردو اکیڈمی آندھراپردیش، چوتھی منزل، حج ہاؤس، نامپلی اور اردو گھر موتی گلی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں انٹر سال اول کی ریاضی، طبیعیات، نباتیات، شہریت اور تاریخ کی اردو درسی کتب تلگو اکیڈمی آندھراپردیش واقع حمایت نگر سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ طلبہ کے سرپرستوں اور مدرسین سے خواہش کی جاتی ہے کہ ان کتابوں سے بھرپور استفادہ کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ تک ان کتابوں کی رسائی کو یقینی بنائیں۔ (رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ہندی میڈیم اسکولوں میں اردو سیکشن کھولنے اور نوڈل افسر کی تقرری پر وزیر اعلا نے حامی بھری

نئی دہلی (۲۴ر ستمبر)۔ اردو کو دہلی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے والی وزیر اعلا شیلا دکشت نے آج اردو کے فروغ اور اساتذہ کی تقرری کے تعلق سے کئی وعدے کیے ہیں، چوں کہ اسمبلی انتخابات نزدیک ہیں اور کچھ روز میں ضابطۂ اخلاق بھی نافذ ہونے والا ہے، ایسے میں ان وعدوں پر عمل درآمد ہونا، اس کے آثار کم ہی ہیں۔ اب جو بھی کوئی پیش رفت ہوگی وہ انتخابات کے بعد ہی ہوگی۔ ملاقات کے دوران وزیر اعلا نے اردو سیل کھولنے سے صاف انکار کردیا جب کہ نوڈل آفیسر کی تقرری کو ہری جھنڈی دے دی۔ فیڈریشن فار ایجوکیشن ڈیولپمنٹ کے ایک وفد نے آج شیلا دکشت سے ملاقات کرکے اپنے مطالبات کی جانب توجہ دلائی۔ وفد میں فیڈریشن کے صدر عبدالعلیم برنی، شکیل احمد، انجمن میاں، مولانا نسیم، چودھری مستقیم، ماسٹر نثار اور سید حسن شامل تھے۔

وفد نے گزشتہ ۱۸ر جون کو دیے گئے اپنے میمورنڈم کی جانب توجہ دلاتے ہوئے وزیر اعلا سے کہا کہ دہلی حکومت کی پالیسی کے مطابق جس اسکول میں چھ بچے اردو پڑھنے والے ہیں وہاں اردو اساتذہ کی تقرری ہونی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی جن ہندی میڈیم اسکولوں میں 100 طلبہ اردو پڑھنے والے ہیں وہاں بھی بغیر کسی مطالبے کے اردو کا سیکشن کھلنا چاہیے۔ وفد نے اسکالرشپ کی شرائط کو بھی آسان بنانے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اسکالرشپ کے لیے دہلی میں پانچ برس کا قیام ضروری تھا لیکن بعد میں یہ مدت تین برس کردی گئی، اب ہمارا مطالبہ ہے کہ تین برس کی شرط بھی ہٹائی جائے تاکہ اقلیتی طلبہ اس اسکیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں۔ غور طلب ہے کہ اسی وفد نے گزشتہ روز دہلی اقلیتی کمیشن کے صدر صفدر ایچ خاں سے ملاقات کرکے اسکالرشپ کی تین برس کی شرط ختم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ صفدر ایچ خاں نے نمائندہ کو بتایا کہ انھوں نے ایک مکتوب متعلقہ محکمے کو روانہ کردیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ہی پانچ برس کی شرط کم کراکے تین برس کرائی تھی۔ وفد نے وزیر اعلا سے کہا کہ اردو کے فروغ اور اساتذہ کی تقرری کی مانیٹرنگ کے لیے نوڈل آفیسر کا تقرر کیا جائے، ساتھ ہی محکمۂ تعلیم میں اردو سیل کا قیام بھی کیا جائے۔ وفد کی باتیں سننے کے بعد وزیر اعلا نے کہا کہ ہندی میڈیم اسکولوں میں اردو پڑھنے والے بچوں کے لیے اردو سیکشن کھولنے کے لیے ہم تیار ہیں۔ اسکالرشپ پر وزیر اعلا نے کہا کہ اسمبلی انتخابات قریب ہیں اور ضابطۂ اخلاق بھی نافذ ہونے والا ہے اس لیے اب اس پر عمل کرنا آسان نہیں ہے۔ وزیر اعلا نے نوڈل آفیسر کے تقرر پر رضامندی ظاہر کی مگر محکمۂ تعلیم میں اردو سیکشن کھولنے کی بات ٹالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر ہم نے اردو سیل قائم کردیا تو پنجابی و دیگر زبانوں کے لوگ بھی اپنا سیل کھولنے کا مطالبہ کریں گے، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ انتخاب کے پیش نظر یہ کام ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ انتخاب کے بعد ضرور اس پر غور کیا جائے گا۔ قابل ذکر ہے کہ وزیر اعلا نے تین روز قبل اردو اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے الگ سے ایک ڈائٹ (دِلّی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ) سنٹر کھولنے کی منظوری دی تھی اور ساتھ ہی اردو اساتذہ کی تقرری کا بھی وعدہ کیا تھا۔ (انقلاب۔ دہلی)

نارائن پیٹ ڈویژن کے اردو میڈیم مدارس میں

اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرری کا مطالبہ

نارائن پیٹ (۲۵ر اگست)۔ نارائن پیٹ ڈویژن کے اردو میڈیم مدارس میں اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقررات عمل میں لانے کا مطالبہ کرتے ہوئے جناب رؤف حسام الدین (سکریٹری اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن سوما) نے جناب وحید نثار (ڈپٹی ایجوکیشنل آفیسر نارائن پیٹ) سے ان کے دفتر میں ملاقات کرکے نمائندگی کی اور کہا کہ یہاں اردو میڈیم کے کئی پرائمری مدارس میں ایک بھی اردو میڈیم مدرس موجود نہیں، جس کے سبب دیگر اردو مدارس کے اساتذہ کو Deputaion پر بھیجا گیا ہے۔ دو اساتذہ میں سے ایک مدرس Deputation پر بھیجنے کے بعد کئی مدارس میں پانچ جماعتوں کے لیے صرف ایک مدرس ہی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لیے ڈی ایس سی کے ذریعے اساتذہ کے تقررات تک خالی اسامیوں پر عارضی مدرسین کی تعیناتی عمل میں لائی جائے۔ جناب وحید نثار ڈپٹی ڈی ای او نے بتایا کہ حکومت کی جانب سے عارضی مدرسین کی تعیناتی کے لیے تاحال احکام وصول نہیں ہوئے ہیں، اس کے باوجود اس صورت حال اور مسائل کے حل کی کوشش کی جائے گی۔ جناب رؤف حسام الدین نے ڈویژن کے دو اپر پرائمری اسکول موضع کاکرگی (ورم گندہ منڈل) اور دولت آباد مستقر کے اسکولوں کو ہائی اسکول کے طور پر اپ گریڈ کرنے کے لیے کہا، جس پر انھوں نے مثبت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے تفصیلات کے حاصل ہونے کے بعد ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ اردو میڈیم کے بعض اسکولوں میں تاحال یونیفارم کی تقسیم عمل میں نہیں لائی گئی ہے۔ ان اسکولوں میں جلد از جلد یونیفارم فراہم کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ (رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ناگ پور یونیورسٹی نے ڈاکٹر اطہر حیات کو بسٹ ٹیچر ایوارڈ سے سرفراز کیا

ناگ پور (ڈاک سے)۔ راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگ پور یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر اطہر حیات کو بسٹ ٹیچر ایوارڈ ۲۰۱۳ کے اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں ۵ر ستمبر کو یوم اساتذہ کے موقعے پر آئی آئی ٹی کان پور کے ڈائرکٹر پروفیسر سنجے دھانڈے کے دست مبارک سے دیا گیا۔ جلسے کی صدارت ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ولاس سپکالے نے فرمائی۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر مہیش ینکی، رجسٹرار اشوک گوماسے اور مینجمنٹ کونسل کی رکن ڈاکٹر ارچنا نیرکر کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ و طالبات کثیر تعداد میں موجود تھے۔

واضح ہو کہ ڈاکٹر اطہر حیات ناگپور میں یشودا گرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ یونیورسٹی میں بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین اور اکیڈمک کونسل کے رکن بھی ہیں۔ موصوف کی اب تک چھ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف موضوعات پر ۵۰ سے زائد مضامین و مقالے بھی منظر عام پر آچکے ہیں، ان کی دو کتابیں یونیورسٹی میں اردو کے نصاب میں شامل ہیں۔

صرف دو کمروں میں اردو مڈل اسکول

ہاتھو گر، بہار۔ چپا گر اسکول کی حالت اتنی خستہ ہے کہ بارش ہونے پر پانی ٹپکنے لگتا ہے۔ اسکول کے رجسٹر کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ صرف دو کمرے بچے ہیں جس میں 635 طلبہ کو بٹھایا جاتا ہے۔ اسکول میں چار اساتذہ اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ تین بی ایل او ہیں وہ ہمیشہ اسکول سے باہر رائے دہندگان کے رجسٹریشن کے لیے جاتے ہیں۔ صرف ایک ٹیچر 365 طلبہ کے لیے درس و تدریس کا کام انجام دیتے ہیں۔ کمرے کی تعمیر کے لیے محمد منصور ڈی پی او نے دو بار اسکول بلڈنگ کا جائزہ لے چکے ہیں، تیسری بار آکر پرنسپل کو یقین دلایا کہ بلڈنگ تعمیر کے لیے بل پاس ہو چکا ہے۔ اسی بیچ ایڈیشنل کلکٹر نے بھی بلڈنگ کو دیکھا، لیکن اس کے باوجود بھی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

دہلی اردو اکادمی کے اردو وراثت میلے میں

انجمن کے بک ڈپو کی شرکت

نئی دہلی۔ دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۲۰ تا ۲۳ر ستمبر ۲۰۱۳ لال قلعے کے سبزہ زار پر اردو وراثت میلے کا انعقاد کیا گیا، جس میں مختلف پروگراموں کے ساتھ کتاب میلے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کتاب میلے میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے بک ڈپو کا بھی اسٹال لگا تھا۔ انجمن کے اسٹال سے تقریباً 11,000 روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ (ادارہ)

اردو میڈیم ہاسٹلوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر کا مطالبہ

عادل آباد (۲۳ر ستمبر)۔ عادل آباد میں پری میٹرک اور پوسٹ میٹرک اردو میڈیم ہاسٹلوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر اور اقلیتوں کے لیے سب پلان کی منظوری کے مطالبے پر کل جماعتی قائدین اور مختلف تنظیموں کی جانب سے کلکٹریٹ عادل آباد کے روبرو احتجاجی دھرنا منظم کیا گیا۔ اسکولوں اور ہاسٹلوں کے طلبہ اپنے ہاتھوں میں پلے کارڈس اور بینرس تھامے ہوئے تھے۔ احتجاج کی قیادت سید ساجد الدین نے کی۔ سید ساجد الدین (صدر ٹاؤن ٹی آر ایس عادل آباد)، شفیع اللہ خاں، یونس اکبانی، ظہور احمد، مفتی مصطفیٰ مظاہری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عرصۂ دراز سے عادل آباد میں پری میٹرک اور پوسٹ میٹرک اردو میڈیم ہاسٹلس کرایے کی عمارتوں میں چلائے جارہے ہیں۔ ہاسٹلوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے حکومت کی جانب سے 16 کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں تاہم ضلع حکام کی جانب سے اراضی کی نشان دہی میں تاخیر کے باعث آج تک تعمیری کاموں کا آغاز نہیں ہوسکا، جس کے نتیجے میں طلبہ و طالبات کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مذکورہ قائدین نے کہا کہ ضلعی عہدیداروں کی تساہلی کے باعث 16 کروڑ روپے حکومتی فنڈ کے واپس ہوجانے کے امکانات ہیں۔ انھوں نے اسکالرشپس کی بھی جلد از جلد فراہمی کے لیے اقدام پر زور دیا۔ بعد ازاں ایک یادداشت ضلع کلکٹر عادل آباد جناب احمد بابو کو پیش کی گئی۔ کلکٹر نے ہاسٹل کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے اراضی کی عاجلانہ نشان دہی اور تعمیری کاموں کے آغاز کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ایک زندہ حقیقت
(خودنوشت، اردو ترجمہ)
مصنف : ڈاکٹر اصغر علی انجینئر
مترجم : قدیر زماں
ضخامت : ۳۳۰ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتا : ادارہ جدید فکر و عصری ادب
16-10-49، حیدرآباد
آندھرا پردیش 500036
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

ڈاکٹر اصغر علی انجینئر موجودہ دور کے سیکولر فکر و نظر کی علامت ہیں اور یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ قدیر زماں نے ان کی انگریزی میں لکھی ہوئی خودنوشت سوانح عمری کا ترجمہ آسان اور سلیس زبان میں کر کے اردو قارئین کو فیضیاب پہنچایا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت قدیر زماں نے کہیں کہیں پر کچھ تفاصیل کو حذف کیا ہے یا پھر ان کی تلخیص پیش کی ہے کیوں کہ اردو کے قارئین ان تفاصیل سے پہلے ہی واقف ہیں اور ان کو تحریر میں لانا نہ صرف طوالت کا باعث بن جاتا بلکہ ثقالت کا سبب بھی بن جاتا۔ اردو ترجمے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدیر زماں نے کتاب کی روح کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور اس پر طبع زاد تخلیق ہونے کا گماں ہوتا ہے۔

خودنوشت سوانح حیات کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اس دور کے اہم واقعات پر بھی حتی المقدور روشنی ڈالے تاکہ قاری ایسے واقعات پر سوانح نگار کی صحیح رائے جان سکے جو کسی حد تک تاریخ کا کام بھی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اختصار و ایجاز، فضول باتوں سے اجتناب، خودستائی و تعلّی سے پرہیز اور خوش نما اسلوب سوانح کی مبادیات میں شامل ہیں۔ اصغر علی انجینئر نے اپنی سوانح میں ان بنیادی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے اپنی زندگی سے وابستہ ان واقعات و حادثات کا ذکر کیا ہے جن کا سامنا انھیں وقتاً فوقتاً کرنا پڑا۔ باوجود یکہ کئی بار ان کی جان پر بھی بن آئی لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نامساعد حالات سے لڑتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اصغر علی کی حیات مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے اقربا کی پریشانیوں کی پروا نہ کر کے ہمیشہ حق کے لیے لڑتے رہے اور اسلام کا صحیح پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلاتے رہے۔ ان کا پیغام امن و آشتی اور انسانی اخوت و بھائی چارے کا پیغام ہے۔ چناں چہ اس بارے میں لکھتے ہیں: ''میں نے سات بنیادی قدروں کا ذکر کیا۔ مساوات، سچائی، انصاف، امن، عدم تشدد، خلوص اور انسانی وقار۔ دنیا کا کوئی مذہب انھیں جھٹلا نہیں سکتا''۔ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے آئے دن اپنے خیالات کا اظہار ملکی اور غیر ملکی اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھ کر کیا۔ اتنا ہی نہیں، انھوں نے ایشیا، افریقہ، امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کے کئی ملکوں کا دورہ بھی کیا جہاں انھوں نے تقاریر کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر معتبر دلائل کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کیا جس کو سن کر کئی قدامت پسند عالم بھی ان سے اتفاق کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اکثر مقامات پر ان کے نظریات کی خوب پذیرائی ہوئی اور انھیں کانفرنسوں میں شرکت کے لیے بار بار بلایا گیا۔ ان کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'دی رائٹ لائیولی ہڈ ایوارڈ' (The Right Livelihood Award)، جو نوبل پرائز کے برابر مانا جاتا ہے، سے بھی نوازا گیا۔

پیشہ ور انجینئر ہونے کے باوجود اصغر علی سماج سدھار کے میدان میں کود پڑے اور ابتدا میں اپنے ہی بوہرہ فرقے کے سربراہ 'سیدنا' کی، جن کا دبدبہ ساری دنیا میں ہے، آمریت اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ نتیجے میں کئی بار ان پر ہندستان اور بیرونی ممالک میں جان لیوا حملے ہوئے مگر وہ بچ نکلے اور اپنی اصلاحی تحریک جاری رکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فرقہ واریت کے خلاف بھی مہم چھیڑی اور ہندستان میں جہاں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، جائے واردات پر جا کر ان کی خود تفتیش کی تاکہ سچ کو سامنے لایا جا سکے۔ اس طرح انھوں نے سیاست دانوں، پولیس اور پیشہ ور مجرموں کی آپسی ملی بھگت کا پردہ فاش کیا۔ ان کی ان کوششوں میں کئی ترقی پسند ادیبوں، انسانی حقوق کے پاسبانوں اور صحافیوں نے پُرخلوص حمایت کی۔ زیر نظر سوانح میں اصغر علی انجینئر کی زندگی کے دوران رونما ہوئے ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات کی مختصر روداد بھی ملتی ہے جن میں بابری مسجد کا سانحہ بھی شامل ہے۔ ہندستان کی جمہوریت اور تکثیریت کو بچانے کے لیے اصغر علی ہمیشہ پابہ رکاب رہے اور اپنے ہم منصبوں سے مدد لیتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے پولیس کے لیے ورکشاپس کا بھی انعقاد کروایا۔

اصغر علی اقبال اور مارکس سے بہت متاثر تھے۔ اس عقیدے کا مظاہرہ انھوں نے خاص طور سے روس میں کیا۔ انھوں نے اپنی سوانح میں کئی ہم عصر ادیبوں، شاعروں، علمی ہستیوں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی علما کی شخصیت پر اپنے تلخ و شیریں تاثرات درج کیے ہیں۔ اپنے اسفار کے دوران پیش آئے دل چسپ واقعات کا ذکر بھی انھوں نے انہماک کے ساتھ کیا ہے جیسے سعودی عرب میں کیرلا کے باشندوں کے ساتھ نسلی امتیاز کا مظاہرہ، اپنی میراث کو منہدم کر کے وہابیوں کی تنگ نظری اور انتہا پسندی، ازبکستان میں مسلمانوں کی قرآن سے ناواقفیت اور انڈونیشیا میں ہندو اساطیر کا اسلامی روایات کے ساتھ خلط ملط ہونا اور پیغمبر اسلام کو 'مولانا وشنو' کے نام سے یاد کیا جانا وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے سفر کے دوران جو دل چسپ مقامات دیکھے ان کی منظرکشی کرنا نہیں بھولے تاکہ قاری کے ذہن میں تجسس کی جوت جگا سکیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ سوانح حیات صرف ان کی زندگی کی روداد بن کر نہیں رہی ہے بلکہ اس میں دین و دنیا کی معلومات، دل چسپ واقعات، مختلف فلسفہ جات و نظریات اور دلکش مناظر کا جائزہ بڑی خوبی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے جس کے باعث اس میں رنگا رنگی پیدا ہو چکی ہے۔

بہ قول شبیر الحسن ''اصغر علی انجینئر کو اس حیثیت سے یاد رکھا جائے گا کہ وہ اسلام کے ایسے مبصر ہیں جو تخلیقی توجیہات پیش کرنے میں ماہر ہیں اور دستور ہند میں جو آزاد خیالی اور سیکولر اقدار کی تدوین ہے اس کی تشہیر کے رستم زماں۔ ان کی زندگی شاہد ہے کہ انسان اپنی روایتوں سے بندھا رہ کر بھی لبرل اور برگزیدہ ہو سکتا ہے''۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوانح حیات نہ صرف سوانحی اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے بلکہ موجودہ دور کی اس تاریکی میں مشعلِ راہ کا کام بھی کر سکتی ہے۔ ●●

بقیہ: سرور صاحب میری نظر میں

صفحہ ۳ سے آگے

جدید ہو گئے اور اب اقبالیے ہو گئے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری پر سیمنار کراتے ہیں۔ ویسے ان کی اقبال دوستی نئی نہیں ہے۔ کوئی پچیس برس اُدھر کی بات ہے۔ میں نے مسعود حسن رضوی صاحب سے پوچھا کہ اقبال کے اس شعر میں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

تین سو سال سے کیا مراد ہے؟ وہ نہ بتا سکے اور کہا سرور صاحب سے پوچھیں کہ وہ بڑے اقبالیے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ مجدد الف ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ سرور صاحب کے قدیمی اقبالیے ہونے کی منزل گئی۔ ان کی جدیدیت کی جب سے ترقی پسند ان سے کھنچ گئے۔ ایک زمانے میں یہ خبر زوروں میں گرم تھی کہ سرور صاحب کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے والے ہیں۔ سرور صاحب نے مجھ سے کہا کہ کشمیر کے وزیر اعلا صادق صاحب ایسا چاہتے تھے لیکن سرور صاحب کے قدیمی دوست سجاد ظہیر مرحوم نے صادق صاحب کو اس کے خلاف مشورہ دیا۔

جس طرح ساہتیہ اکیڈمی پر یہ داغ ہے کہ اس نے کرشن چندر کو کبھی ایوارڈ نہیں دیا، اسی طرح یوپی اردو اکیڈمی پر بھی یہ داغ رہے گا کہ اس نے سرور صاحب کے ایک مجموعۂ مضامین پر تین ہزار کے بجائے صرف دو ہزار کا انعام دیا۔ سرور صاحب کے قلم سے جو تحریر بالخصوص تنقیدی تحریر نکلے گی وہ قدر اوّل کی ہوگی۔ اس پر انعام دینا ہے تو سب سے بڑا دیجیے ورنہ کچھ نہ دیجیے۔ آنند نرائن ملا نے سرور صاحب کی انجمن کی جنرل سکریٹری شپ کی تجدید نہیں کی۔ لیکن جہاں تک مجھے بھنک پڑی ہے ۱۹۷۳ میں سرور صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا اعزاز دینے میں ملا صاحب کا بھی دخل تھا۔

زرکوں نے ارشاد کیا ہے کہ کام کرنے میں سو عیب ہیں نہ کرنے میں ایک عیب۔ سرور صاحب دنیا بھر کے اداروں سے وابستہ رہے، ڈھیر سے لوگوں کو ناآسودہ کیا، دشمنوں کے پرے کے پرے کھڑے کر لیے۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیوں صاحب اگر یہ کہیں کہ ہر شخص اپنے دشمنوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تو کیسا رہے؟ سرور صاحب کے دشمنوں کی صف پر نظر ڈالیے۔ عقل کا نگارخانہ ہے۔ اردو کے کیسے کیسے جغادری شاعر، نقاد، محقق، خادم اردو دکھائی دیتے ہیں۔ اس محفل میں کوئی تو بات ہے کہ قاتلوں میں اچھے بڑے بڑے عمائد ادب ہیں۔ میں اگر چاہوں کہ ایسے بقراطوں کو اپنا مخالف بناؤں تو نہیں بنا سکتا کیوں کہ یہی میرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیفیت یہ ہے کہ دونوں میں سرور صاحب کے معاندوں کا معیار و مقدار دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔ شگفتہ تقریر لکھنے اور چٹکلے بولتے سیمنار کرانے کے ساتھ ساتھ سرور صاحب دشمن بنانے کے فن میں بھی حاذق دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے دیوان خانے کے گلدستوں کو زخموں کے گلابوں سے سنوارتے ہوں گے۔

میں سرور صاحب کا معترف اور معتقد ہوں۔ مجھے ان کی نگارش، ان کی انشا، ان کا تجزیہ و تقریر، ان کی گفتار و کردار پسند ہیں۔ اگر ان میں کچھ خامیاں

ہیں تو مجھے ان کی شخصیت ان خامیوں کے ساتھ عزیز ہے کیوں کہ اوصاف کی تابانی میں وہ خامیاں ماند پڑ کر مدھم پڑ جاتی ہیں۔ پروفیسری میں وہ میرے آدرش ہیں۔ ایسا آدرش کہ اس جنم میں تو میں ایسا بن نہیں سکتا۔ اور جہاں تک تنقید کا سوال ہے، میں نے اپنے مجموعے "ذکر و فکر" کو ان کے نام منسوب کرتے وقت انھیں اپنا مثالی نقاد قرار دیا۔

حاشیہ:

۱۔ چپ رہو تو سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

(شعر یہ ذکر اور پہچان ۱۹۹۰ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی)

◆◆◆◆◆

بقیہ: مجتبیٰ حسین پر دو کتابوں کی اشاعت

صفحہ ۸ سے آگے

شناس نامہ: حیدرآباد وحید اختر کا تحریر کردہ ہے جس میں انھوں نے کھلے دل سے مجتبیٰ حسین کی شخصی اور فنی خوبیاں مفصل بیان کی ہیں۔ انھوں نے جرأت سے کر عثمانیہ یونیورسٹی کی بزم ادب کے سکریٹری شپ کے الیکشن میں اپنے سے جونیئر مجتبیٰ حسین کے ہار جانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ مجتبیٰ حسین کبھی بھی اپنے دل میں کسی کے لیے نفرت کا جذبہ نہیں رکھتے اور ضرورت پڑنے پر مدد بھی کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا مضمون سفرنامہ 'جاپان چلو جاپان چلو' پر ہے۔ نارنگ صاحب کے مطابق ادبی تاریخ میں دو ایسے مواقع آئے جب دکن نے شمال کو زیر کرلیا۔ پہلی بار جب ولی کا دیوان دہلی آیا اور دوسری بار جب مجتبیٰ حسین نے دہلی میں سکونت اختیار کی اور یہاں کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ مجتبیٰ حسین کے فن میں بڑی وسعت ہے اور مزاح پیدا کرنے کی جتنی تکنیکیں اور طریقے ہیں وہ فطری طور پر ان سب سے لیس ہیں۔ وہ صورت حال کے ساتھ ساتھ مبالغہ اور تقابل سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ کردار نگاری ان کے مزاح کی ایک اور اہم خوبی ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مجتبیٰ حسین کو مرزا فرحت اللہ بیگ کا روحانی فرزند قرار دیتے ہوئے انھیں انسانی عظمت کا نگہبان قرار دیا ہے۔

مشفق خواجہ اور افتخار حسین کے دو دو کالم بھی اس کتاب کی زینت ہیں جو مجتبیٰ حسین کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ مضمون 'مجتبیٰ حسین اور مزاح نگاری' میں نسیم حنفی نے انھیں اس بھٹکی ہوئی صنف (طنز و مزاح) کا سفیر قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق مجتبیٰ حسین کے مزاج میں برجستگی، بے تکلفی، خوش طبعی اور خوش باشی کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کے مضامین اور سفرناموں میں خالص مزاح کے نقوش نمایاں ہیں۔ اپنائیت اور سادہ دلی مجتبیٰ حسین کی شخصیت کی بھی خوبیاں ہیں اور تحریر کی بھی۔ ان کی تحریروں کا تہذیبی پس منظر حیدرآباد کی معاشرتی زندگی اور وہ ہے اور تہذیبی فضا سے عبارت ہے۔

مجتبیٰ حسین پر فکر تونسوی کا خاکہ دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

"ایک مرتبہ میں نے اسے دیکھا کہ کسی ننھے بچے کو لیے سڑک پر کھڑا لوریاں دے رہا ہے۔ کہنے لگا: "فکر بھائی! اس کی ماں کہانی لکھنے میں مصروف ہے۔ اگر کہانی نہ لکھی گئی تو اردو ادب کا مستقبل جو پہلے ہی تاریک ہے اور بھی تاریک ہو جائے گا۔"

شہریار، یوسف ناظم، ظفر الحسن، رفعت سروش، مظفر حنفی، وجاہت علی سندیلوی، زبیر رضوی، نریندر لوتھر، علی باقر، تقی تنویر، یوسف علی خان، وہاب عندلیب، رشید قریشی، مسیح انجم، اسید رحمت علی، بیگ احساس، اختر حسن، دلیپ سنگھ، علی ظہیر، فیاض احمد فیضی اور خالد قادری وغیرہ نے بھی مجتبیٰ حسین پر اہم اور دلچسپ خاکے تحریر کیے ہیں۔ مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ "اگر فکر تونسوی طنز نگاروں کے بے تاج بادشاہ تھے تو مجتبیٰ حسین بلاشرکت وزیر اعظم۔ اب تو خیر تیسری دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح اس مملکت خداداد میں بھی صدر اور وزیر اعظم کا عہدہ ایک ہی شخص کے ہاتھوں میں ہے۔ فکر تونسوی کے بعد مجتبیٰ حسین بلاشرکت غیرے طنز و مزاح کی دنیا کے آئینی سربراہ بھی ہیں اور عملی حکمراں بھی۔" (مجتبیٰ حسین۔ جیسا دیکھا، ویسا پایا، صفحہ۔ 132)

نثار احمد فاروقی نے اپنے مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے مزاج میں جزو اعظم ان کا وہ گہرا شعور ہے جو معمولی انسان کے دکھوں سے خود کو جوڑے رہتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، بے تکلف، آورد سے پاک اور بڑا جانا پہچانا ہے۔ وہ کبھی حد ادب سے تجاوز نہیں کرتے اور دو ٹوک باتیں بھی ہنسی ہنسی میں نہایت شائستہ انداز میں کہہ جاتے ہیں۔

بیگ احساس نے اپنے مضمون میں مجتبیٰ حسین کی دوست نوازی اور تعلقات نبھانے کی عادت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

"مجتبیٰ حسین جب تک اسکوٹر سے سفر کرتے رہے، تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا... آج مجتبیٰ گھر بیٹھے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔ دلی جائیں ایک سے ملاقات کریں تو دوسرا ناراض۔ ان کو جوڑے رکھنے والی درمیانی ڈور اب ست کر رہ گئی ہے۔" (مجتبیٰ حسین۔ جیسا دیکھا، ویسا پایا، صفحہ۔ 145)

منظوم خراج تحسین کے تحت اس کتاب میں جن شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے ان میں رضا نقوی واہی، رؤف رحیم، غالب خوند میری، رحمن جامی اور حنین امروہوی وغیرہ اہم ہیں۔

"مجتبیٰ حسین۔ جیسا دیکھا، ویسا پایا" کے آخری حصے میں مجتبیٰ حسین پر خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، سید عارف حسینی، علی باقر، طراز ورما اور تقی علی کے انگریزی میں لکھے گئے مضامین اور کالموں کو جگہ دی گئی ہے۔

دونوں کتابوں کے آخری صفحات میں ارکان خاندان اور مشاہیر ادب و سیاست کے ہمراہ مجتبیٰ حسین کی سادہ اور رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ دونوں کتابیں دستاویزی اور حوالہ جاتی حیثیت کی حامل ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی زندگی کے تمام اہم موڑ، سنین اور تواریخ کے ساتھ اس میں درج ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو اچھوتا رہ گیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مداحوں، تحقیق کے طلبہ اور عام قارئین سب کے لیے یہ کتابیں کارآمد ہیں۔ امید ہے کہ ادب کی دنیا میں ان کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔ یہ کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-6 سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

◆◆◆

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت پر دو کتابوں: 'مجتبیٰ حسین: آئینوں کے بیچ' اور 'مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا ویسا پایا' کی اشاعت: ایک جائزہ

ڈاکٹر فیروز عالم (نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد- 500032)
E-mail: firozdde@gmail.com

مجتبیٰ حسین دور حاضر میں اردو طنز و مزاح کی آبرو ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں انھوں نے جتنا لکھا ہے اور جس معیار کا لکھا ہے سوائے مشتاق احمد یوسفی کے اس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، کالم وغیرہ اصناف کو انھوں نے اپنی جدت طبع اور تخلیقیت کے ذریعے نئی بلندیاں عطا کی ہیں۔ ان کے بعض جملوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے طنز کے ساتھ ساتھ مزاح سے بھی بخوبی کام لیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں واقعات کے سہارے بھی مزاح پیدا کیا گیا ہے اور الفاظ کے حسن استعمال سے بھی۔ مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی دونوں کے اسالیب کی چاشنی ملتی ہے۔ وہ لفظوں کے مزاج داں ہیں۔ وہ ذومعنی لفظوں کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ محاکات نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ محاورات اور ضرب الامثال کو کبھی ان کی اصلی صورت میں اور کبھی ان میں ذرا سی ترمیم کر کے وہ نثر کے حسن میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔

خاکہ نگاری کے فن میں مجتبیٰ حسین کو خاص طور سے کمال حاصل ہے۔ انھوں نے کثیر تعداد میں مختلف النوع اشخاص پر خاکے لکھے ہیں اور جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کی سیرت و شخصیت، کردار و گفتار اور ذہن و فکر پر ہمدردانہ لہجے میں روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔ وہ کسی کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں تو ان کا رویہ تمسخر یا تضحیک کا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک مخلص اور خیرخواہ دوست کی طرح مہذب انداز میں مخفی خامیاں بیان کرتے ہیں اور انداز ایسا ہوتا ہے گویا یہ کوئی اچھی بات ہے۔ ان خاکوں میں اپنے ممدوح کی شخصیت کے اسرار و رموز سے واقف کراتے ہوئے انھوں نے اپنی شخصیت کے بہت سے مخفی گوشوں پر سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔

پچاس سالہ تخلیقی سفر کے دوران میں مجتبیٰ حسین کی چوبیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو کتابیں ترتیب دی ہیں اور ماہنامہ 'آج کل' کا طنز و مزاح نمبر بھی بطور مہمان مدیر مرتب کیا ہے۔ ان کی کتابوں کے تراجم ہندی کے علاوہ کئی دیگر ہندوستانی اور غیرملکی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ہندی میں ان کی سات کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی سرکاری اور غیرسرکاری اعزازات بھی پیش کیے گئے ہیں۔

حال ہی میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مختلف مضامین پر مشتمل دو کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے عنوانات ہیں: 'مجتبیٰ حسین۔ آئینوں کے بیچ' (قیمت 450 روپے) اور 'مجتبیٰ حسین۔ جیسا دیکھا ویسا پایا' (قیمت: 450 روپے)۔ سید امتیاز الدین اور محمد تقی مبارک باد کے قابل ہیں کہ انھوں نے مجتبیٰ حسین پر لکھا گیا تقریباً تمام مواد (تقریباً 800 صفحات) دو جلدوں میں یکجا کر دیا ہے۔ دونوں مرتبین سبک دوش انجینئر ہیں اور اردو ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مجتبیٰ حسین سے ان کے قلبی تعلق کا اندازہ ان کتابوں کے مشمولات کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں شائع ہونے والی تحریروں کو جمع کرنے میں انھیں کس قدر محنت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

'مجتبیٰ حسین۔ آئینوں کے بیچ' میں 41 مضامین اور آٹھ انٹرویو شامل ہیں۔ ان میں 26 مضامین مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور 12 مضامین میں ان کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں 'توقیت مجتبیٰ حسین' کے تحت ان کی حیات، شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور کا تحریر کردہ 'مجتبیٰ حسین، ایک تاثر' ہے جس میں سرور صاحب نے انھیں wit کا مرد میداں اور بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ مجتبیٰ حسین طنز نگار نہیں مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے مشتاق احمد یوسفی کے حوالے سے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیاں بیان کی ہیں۔ قلم برداشتہ لکھنا، تکرار سے بچنا اور ترو تازگی برقرار رکھنا۔ دوسرا مضمون ہمارے عہد کے سربرآوردہ ناقد شمس الرحمن فاروقی کا ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح کی اس ادبی روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سودا اور میر سے ہوتے ہوئے پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ تضاد، تناسب اور توازن کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ صدیق الرحمن قدوائی نے مجتبیٰ حسین کی حیدرآباد سے وابستگی، سفر کرنے کی عادت اور باریک بینی پر روشنی ڈالی ہے۔ قمر رئیس نے اپنے مضمون 'مجتبیٰ حسین کے مزاحیوں میں معنوی آہنگ' میں مجتبیٰ حسین کے ہنساتے ہنساتے رلا دینے کے کمال، سماج کے نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل کے گہرے ادراک، محروم اور مجبور انسانوں کے دکھوں اور محرومیوں کے شدید احساس پر گفتگو کی ہے۔

مغنی تبسم نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے چوکھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انھیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ انھوں نے سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویوں، عادتوں اور خصائل کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے۔ وہ محاکات نگاری اور پیکر تراشی سے خوب کام لیتے ہیں۔ وہ دراصل لفظوں کے مزاج داں ہیں۔ عتیق اللہ نے ان کے فن کو صرف اور صرف خوشی بانٹنے کا فن کہا ہے۔ مصطفی کمال نے مجتبیٰ حسین کے فن کی ایک اہم خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے: "ان کے خاکوں میں ممدوح کے ساتھ خاکہ نگار کا کردار بھی سایہ کی طرح ساتھ لگا رہتا ہے۔" (مجتبیٰ حسین: آئینوں کے بیچ، صفحہ 67) افسانہ نگار رضیہ فصیح احمد نے 'مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری میں افسانویت' کے زیر عنوان ان کے مضامین میں کہانی پن تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے مضامین میں باقاعدہ ابتدا ہوتی ہے، پھر وہ کہانی کی طرح آگے بڑھتا ہے اور باقاعدہ اختتام ہوتا ہے۔ درمیان میں چٹکلوں پر قاری ہنستا جاتا ہے اور کہانی کا سسپنس اسے آگے پڑھنے پر اکساتا ہے۔ (مجتبیٰ حسین: آئینوں کے بیچ، صفحہ 77)

مصحف اقبال توصیفی نے اپنے مضمون میں مجتبیٰ حسین کے فن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق مزاج کی سادگی، مذاق کی عادت اور انسانی دکھ کا گہرا احساس ان کے مضامین کو ایک منفرد لب ولہجہ عطا کرتا ہے۔ نامی انصاری نے اپنے طویل مضمون میں مجتبیٰ حسین کے طرز و فن کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں مزاحیہ مضامین، خاکوں اور سفرناموں میں ان کی زبان و اسلوب، کردار نگاری، مزاح کے مختلف پہلو، جزئیات نگاری اور وسیع مطالعہ و مشاہدہ وغیرہ کی خوبیاں زیر بحث آئی ہیں۔ نامی انصاری نے انھیں عہد حاضر کا درجہ اول کا خاکہ نگار قرار دیا ہے۔ اشفاق احمد ورک نے 'مجتبیٰ حسین: بھارت کا مشتاق احمد یوسفی' میں انھیں ہندستان میں طنز و مزاح کا حرف آخر گردانا ہے۔ حسن چشتی، علی ظہیر، نسیم الدین فریس، منظور عثمانی، رحمن مومن، تیغ، سید محمود خاور اور اسلم فاروقی کے مضامین میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے مختلف پہلو اجاگر کیے گئے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری سے متعلق انور معظم، عمیق حنفی، مخمور سعیدی، مظفر حنفی، یوسف سرمست، اشرف رفیع، بیگ احساس، اکمل نیازی، حلیم صبا نویدی اور صابر علی سیوانی کے مضامین بہت اہم اور معلومات افزا ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری پر انور سدید، مظہر امام اور قمر علی عباسی کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں مجتبیٰ حسین کے آٹھ انٹرویو دیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے مجتبیٰ حسین کی زندگی کے اہم واقعات، نشیب و فراز، علمی فتوحات، ادبی کارناموں، حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول اور معاصر ادبی منظرنامے سے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے فن و شخصیت پر دوسری کتاب جس کا ذکر مقصود ہے اس کا عنوان ہے 'مجتبیٰ حسین۔ جیسا دیکھا ویسا پایا'۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ ایک مضمون خود مجتبیٰ حسین نے اپنے بارے میں 'اپنی یاد میں' کے زیر عنوان لکھا ہے۔ ایک اہم انٹرویو بھی شامل کتاب ہے جس میں زبیر رضوی، مخمور سعیدی، نگار ہاشمی اور حامد اکمل نے مجتبیٰ حسین سے گفتگو کی ہے۔ اس میں 51 مضامین کے علاوہ 11 نظمیں بھی شامل ہیں جو مجتبیٰ حسین کی تعریف و تحسین میں کہی گئی ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون 'مجتبیٰ حسین کا

(بقیہ صفحہ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں مطبوعہ: قمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org